شامِ شہرِ یاراں
فیض احمد فیض
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
اشتراک
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نئی دہلی

# شامِ شہرِ یاراں



فیض احمد فیض

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی



Sham-e-Shahr-e-Yaran
by
Faiz Ahmad Faiz
Rs.65/-

**صدر دفتر**

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

**شاخیں**

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ 110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔ 400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ 202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/65 روپے

ISBN:978-81-7587-851-8 سلسلۂ مطبوعات: 1671

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

ہائی ٹیک گرافکس، ڈی 8/2، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II، نئی دہلی 110020
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

# چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظر استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلا شرکت غیرے شائع کی ہیں)۔ زیر نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابل فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ارباب حل و عقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اولین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جا چکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہو رہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود<br>
مینجنگ ڈائرکٹر<br>
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

مجید بھائی اور آمنہ بہن
کے نام

# فہرست

# عہدِ طفلی سے عنفوانِ شباب تک

## مرزا ظفر الحسن سے ایک گفتگو

ہمارے شعرا کو مستقلاً یہ شکایت رہی ہے کہ زمانے نے ان کی قدر نہیں کی۔ ناقدریِ ابنائے وطن ہماری شاعری کا ایک مستقل موضوع ہے۔ ہمیں اس سے اُلٹ شکایت یہ ہے کہ ہم پہ لطف و عنایات کی اس قدر بارش رہی ہے، اپنے دوستوں کی طرف سے، اپنے ملنے والوں کی طرف سے اور ان کی جانب سے بھی جن کو ہم جانتے بھی نہیں کہ اکثر ندامت ہوتی ہے کہ اتنی داد و دہش کا مستحق ہونے کے لیے جو تھوڑا بہت کام ہم نے کیا ہے اس سے بہت زیادہ ہمیں کرنا چاہیے تھا۔

یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ بچپن ہی سے اس قسم کا تاثر رہا ہے۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے، اسکول میں پڑھتے تھے تو اسکول کے لڑکوں کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ خواہ مخواہ انھوں نے ہمیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا حالانکہ لیڈری کی صفات ہم میں نہیں تھیں، یا تو آدمی بہت لٹھ باز ہو کہ دوسرے اس کا رُعب مانیں یا وہ سب سے بڑا فاضل ہو۔ ہم پڑھنے لکھنے میں ٹھیک تھے، کھیل بھی لیتے تھے لیکن پڑھائی میں ہم نے کوئی ایسا کمال پیدا نہیں کیا تھا کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں۔

بچپن کا میں سوچتا ہوں تو ایک یہ بات خاص طور سے یاد آتی ہے کہ ہمارے گھر میں خواتین کا ایک ہجوم تھا۔ ہم جو تین بھائی تھے۔ ان میں ہمارے چھوٹے بھائی (عنایت) اور بڑے بھائی (طفیل) خواتین سے باغی ہو کر کھیل کود میں مصروف رہتے تھے۔ ہم اکیلے ان خواتین کے ہاتھ آ گئے۔ اس کا کچھ نقصان بھی ہوا اور کچھ فائدہ بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ ان خواتین نے ہم کو انتہائی شریفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جس کی وجہ سے کوئی غیر مہذب یا اُجڈ قسم کی بات اس زمانے میں ہمارے منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ اب بھی نہیں نکلتی۔ نقصان یہ ہوا، جس کا مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے کہ بچپن میں کھلنڈر پن یا ایک طرح کے لہو و لعب کی زندگی گزارنے سے ہم محروم رہے۔ مثلاً یہ کہ گلی میں کوئی پتنگ اُڑا رہا ہے، کوئی گولیاں کھیل رہا ہے، کوئی لٹو چلا رہا ہے، ہم بس کھیل کو دیکھتے رہتے تھے، "اکیلے بیٹھ کر، ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے" کے مصداق ہم ان تماشوں کے صرف تماشائی بنے رہتے اور ان میں شریک ہونے کی ہمت اس لیے نہیں ہوتی تھی کہ اسے شریفانہ شغل یا شریفانہ کام نہیں سمجھتے تھے۔

اساتذہ بھی ہم پر مہربان رہے۔ آج کل کی میں نہیں جانتا، ہمارے زمانے میں تو اسکول میں سخت پٹائی ہوتی تھی۔ ہمارے عہد کے استاد تو نہایت ہی جلاد قسم کے لوگ تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ان میں سے کسی نے ہم کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ ہر کلاس میں ہم کو مانیٹر بناتے تھے بلکہ (ساتھی لڑکوں کو) سزا دینے کا منصب بھی ہمارے حوالے کرتے تھے۔ یعنی فلاں کو چانٹا لگاؤ، فلاں کو تھپڑ مارو۔ اس کام سے ہمیں بہت کوفت ہوتی تھی اور ہم کوشش کرتے تھے کہ جس قدر بھی ممکن ہو یوں سزا دیں کہ ہمارے شکار کو وہ سزا محسوس نہ ہو۔ طمانچے کی بجائے گال



تھپتھپا دیا۔ یا کان آہستہ سے کھینچا وغیرہ۔ کبھی ہم پکڑے جاتے تو استاد کہتے یہ کیا کر رہے ہو زور سے چانٹا مارو۔

دو تاثر بہت گہرے ہیں، ایک تو یہ کہ بچوں کی جو دلچسپیاں ہوتی ہیں ان سے محروم رہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے دوستوں، ہم جماعتوں اور اپنے اساتذہ سے ہمیں بے پایاں شفقت اور خلوص ملا جو بعد کے زمانے کے دوستوں اور معاصرین سے ملا اور آج بھی مل رہا ہے۔

صبح ہم اپنے ابا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ اذان کے ساتھ ہم اُٹھ بیٹھے، ابا کے ساتھ مسجد گئے، نماز ادا کی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے جو اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے، درسِ قرآن سنا، ابا کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی سیر کے لیے گئے، پھر اسکول۔ رات کو ابا بلا لیا کرتے خط لکھنے کے لیے۔ اس زمانے میں انھیں خط لکھنے میں کچھ دقت ہوتی تھی۔ ہم ان کے سکریٹری کا کام انجام دیتے تھے۔ انھیں اخبار بھی پڑھ کر سناتے تھے۔ ان مصروفیات کی وجہ سے ہمیں بچپن میں بہت فائدہ ہوا۔ اُردو انگریزی اخبارات پڑھنے اور خطوط لکھنے کی وجہ سے ہماری استعداد میں کافی اضافہ ہوا۔

ایک اور یاد تازہ ہوئی۔ ہمارے گھر سے ملی ہوئی ایک دکان تھی، جہاں کتابیں کرائے پر ملتی تھیں۔ ایک کتاب کا کرایہ دو پیسے ہوتا۔ وہاں ایک صاحب ہوا کرتے تھے جنھیں سب "بھائی صاحب" کہتے تھے۔ بھائی صاحب کی دکان میں اُردو ادب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع تھا۔ ہماری چھٹی ساتویں جماعت کی طالب علمی میں جن کتابوں کا رواج تھا وہ آج کل تقریب قریب مفقود ہو چکی ہیں جیسے طلسم ہوش ربا، فسانۂ آزاد، عبدالحلیم شرر کے ناول وغیرہ۔ یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس کے بعد شاعروں

کا کلام پڑھنا شروع کیا۔ داغ کا کلام پڑھا۔ میر کا کلام۔ غالب تو اس وقت بہت زیادہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسروں کا کلام بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا نہیں آتا تھا۔ لیکن ان کا دل پر اثر کچھ عجب قسم کا ہوتا تھا، یوں شعر سے لگاؤ پیدا ہوا اور ادب میں دلچسپی ہونے لگی۔

ہمارے ابا کے منشی گھر کے ایک طرح کے منیجر بھی تھے۔ ہمارا ان سے کسی بات پر اختلاف ہوگیا تو انھوں نے کہا کہ اچھا آج ہم تمھاری شکایت کریں گے کہ تم ناول پڑھتے ہو۔ اسکول کی کتابیں پڑھنے کی بجائے چھپ کر انٹ شنٹ کتابیں پڑھتے ہو۔ ہمیں اس سے بہت ہی ڈر لگا اور ہم نے ان کی بہت منت کی کہ شکایت نہ کریں مگر وہ نہ مانے اور ابا سے شکایت کر ہی دی۔ ابا نے ہمیں بلایا اور کہا میں نے سنا ہے تم ناول پڑھتے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگے ناول ہی پڑھنا ہے تو انگریزی ناول پڑھو اُردو کے ناول اچھے نہیں ہوتے۔ شہر کے قلعہ میں جو لائبریری ہے وہاں سے ناول لا کر پڑھا کرو۔

ہم نے انگریزی ناول پڑھنے شروع کیے۔ ڈکنس، ہارڈی اور نہ جانے کیا کیا پڑھ ڈالا۔ وہ بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا پلے نہ پڑتا تھا۔ اس مطالعہ کی وجہ سے ہماری انگریزی بہتر ہوگئی۔ دسویں جماعت میں پہنچتے پہنچتے یہ محسوس ہوا کہ بعض استاد پڑھانے میں کچھ غلطیاں کر جاتے ہیں۔ ہم ان کی انگریزی درست کرنے لگے اس پر ہماری پٹائی تو نہ ہوئی البتہ وہ اُستاد کبھی خفا ہو جاتے اور کہتے اگر تمھیں ہم سے اچھی انگریزی آتی ہے تو پھر تم ہی پڑھایا کرو ہم سے کیوں پڑھتے ہو۔

اس زمانے میں کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ جیسے یکایک آسمان کا رنگ بدل گیا ہے۔ بعض چیزیں کہیں دور چلی گئی ہیں۔ دھوپ کا رنگ اچانک حنائی ہوگیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھا، اس



کی صورت بالکل مختلف ہوگئی ہے۔ دنیا ایک طرح کی پردۂ تصویر کے قسم کی چیز محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس کیفیت کا بعد میں بھی کبھی کبھی احساس ہوا ہے مگر اب نہیں ہوتا۔

مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ ہمارے گھر سے ملی ہوئی ایک حویلی تھی جہاں سردیوں کے زمانے میں مشاعرے کیے جاتے تھے۔ سیالکوٹ میں پنڈت راج نرائن ارمان ہوا کرتے تھے جو ان مشاعروں کے انتظامات کرتے تھے۔ ایک بزرگ منشی سراج دین مرحوم تھے۔ علامہ اقبال کے دوست، سری نگر میں مہاراجا کشمیر کے میر منشی۔ وہ صدارت کیا کرتے تھے۔ جب دسویں جماعت میں پہنچے تو ہم نے بھی تُک بندی شروع کر دی اور ایک دو مشاعروں میں شعر پڑھ دیے۔ منشی سراج دین نے ہم سے کہا میاں ٹھیک ہے تم بہت تلاش سے شعر کہتے ہو، مگر یہ کام چھوڑ دو۔ ابھی تو تم پڑھو لکھو اور جب تمھارے دل و دماغ میں پختگی آجائے تب یہ کام کرنا۔ اس وقت یہ تضییعِ اوقات ہے۔ ہم نے شعر کہنا ترک کر دیا۔

جب ہم مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے اور وہاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی اُردو پڑھانے آئے جو اقبال کے مفسر بھی ہیں تو انھوں نے مشاعرے کی طرح ڈالی اور کہا طرح پر شعر کہو۔ ہم نے کچھ شعر کہے اور ہمیں بہت داد ملی۔ چشتی صاحب نے منشی سراج دین کے بالکل خلاف مشورہ دیا اور کہا فوراً اس طرف توجہ کرو شاید تم کسی دن شاعر ہو جاؤ۔

گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے جہاں بہت ہی فاضل اور مشفق اساتذہ سے نیاز مندی ہوئی۔ پطرس بخاری تھے۔ اسلامیہ کالج میں ڈاکٹر تاثیر تھے، بعد میں صوفی تبسم صاحب آگئے۔ ان کے علاوہ شہر کے جو بڑے ادیب تھے امتیاز علی تاج تھے، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری صاحب تھے۔

اختر شیرانی تھے، ان سب سے ذاتی مراسم ہو گئے۔ ان دنوں اساتذہ اور طلبہ کا رشتہ ادب کے ساتھ ساتھ کچھ دوستی کا سا بھی ہوتا تھا۔ کالج کی کلاسوں میں تو شاید ہم نے کچھ زیادہ نہیں پڑھا، لیکن ان بزرگوں کی صحبت اور رحبت سے بہت کچھ سیکھا۔ اُن کی محفلوں میں ہم پر شفقت ہوتی تھی اور ہم وہاں سے بہت کچھ حاصل کر کے اُٹھتے تھے۔

ہم نے اپنے دوستوں سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ جب شعر کہتے تو سب سے پہلے خاص دوستوں ہی کو سناتے تھے۔ ان سے داد ملتی تو مشاعروں میں پڑھتے۔ اگر کوئی شعر خود کو پسند نہ آیا یا دوستوں نے کہا نکال دو تو اُسے کاٹ دیتے۔ ایم۔ اے میں پہنچنے تک باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔

ہمارے ایک دوست ہیں خواجہ خورشید انور۔ ان کی وجہ سے ہمیں موسیقی میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ خورشید انور پہلے تو دہشت پسند تھے، بھگت سنگھ گروپ میں شامل ——— انھیں سزا بھی ہوئی جو بعد میں معاف کر دی گئی۔ دہشت پسندی ترک کر کے وہ موسیقی کی طرف مائل ہوئے۔ ہم دن میں کالج جاتے اور شام کو خورشید انور کے والد خواجہ فیروز الدین مرحوم کی بیٹھک میں بڑے بڑے اُستادوں کا گانا سنتے۔ یہاں اس زمانے کے سب ہی استاد آیا کرتے تھے۔ اُستاد توکل حسین خاں، اُستاد عبدالوحید خاں، اُستاد عاشق علی خاں اور چھوٹے غلام علی خاں وغیرہ۔ ان اُستادوں کے ہم عصر اور ہمارے دوست رفیق غزنوی مرحوم سے بھی صحبت ہوتی تھی۔ رفیق لا کالج میں پڑھتے تھے۔ پڑھتے تو خاک تھے بس رسمی طور پر کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ کبھی خورشید انور کے کمرے میں اور کبھی رفیق کے کمرے میں بیٹھک ہو جاتی تھی۔ غرض اس طرح ہمیں اس فنِ لطیف سے حظ اندوز ہونے کا کافی موقع ملا۔



جب ہمارے والد فوت ہوئے تو پتہ چلا کہ گھر میں کھانے تک کو کچھ نہیں ہے۔ کئی سال تک در بدر پھرے اور فاقہ مستی کی۔ اس میں بھی لطف آیا اس لیے کہ اس کی وجہ سے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کا بہت موقع ملا۔ خاص طور سے اپنے دوستوں سے۔ کالج میں ایک چھوٹا سا حلقہ بن گیا تھا۔ کوئٹہ کے ہمارے دو دوست تھے احتشام الدین اور شیخ احمد حسین۔ ڈاکٹر حمیدالدین بھی اس حلقے میں شامل تھے۔ ان کے ساتھ شام کو محفل رہا کرتی۔ جوانی کے دنوں میں جو دوسرے واقعات ہوتے ہیں وہ بھی ہوئے اور ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

گرمیوں میں تعطیلات ہوتیں تو ہم کبھی خورشید انور اور بھائی طفیل کے ساتھ سری نگر چلے جایا کرتے اور کبھی اپنی ہمشیرہ کے پاس لائل پور پہنچ جاتے۔ لائل پور میں باری علیگ اور ان کے گروہ کے دوسرے لوگوں سے ملاقات رہتی۔ کبھی اپنی سب سے بڑی ہمشیرہ کے ہاں دھرم سالہ چلے جاتے۔ جہاں منظرِ قدرت دیکھنے کا موقع ملتا اور دل پر ایک خاص قسم کا نقش ہوتا۔ ہمیں انسانوں سے جتنا لگاؤ رہا اتنا قدرت کے مناظر اور مطالعۂ حُسنِ فطرت سے نہیں رہا پھر بھی ان دنوں میں نے محسوس کیا کہ شہر کے جو گلی محلے ہیں ان میں بھی اپنا ایک حُسن ہے جو دریا و صحرا، کوہسار یا سرو و سمن سے کم نہیں۔ البتہ اس کو دیکھنے کے لیے بالکل دوسری طرح کی نظر چاہیے۔

مجھے یاد ہے ہم مستی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ ہمارا گھر بالائی سطح پر تھا۔ نیچے بدرو بہتی تھی۔ چھوٹا سا ایک چمن بھی تھا، چار طرف باغات تھے۔ ایک رات چاند نکلا ہوا تھا۔ چاندنی بدرو اور ارد گرد کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ چاندنی اور سائے یہ سب مل کر کچھ عجیب پُراسرار منظر بن گئے تھے۔ چاند کی عنایت سے منظر کی بدوضعی چھپ گئی تھی اور کچھ عجیب ہی قسم کا حُسن پیدا

ہو گیا تھا جسے میں نے لکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایک آدھ نظم میں منظر کشی کی ہے جب شہر کی گلیوں محلّوں اور کٹڑیوں میں کبھی دوپہر کے وقت کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا روپ آجاتا ہے جیسے معلوم ہو کوئی پرستان ہے۔ نیم شب' چاند' خود فراموشی' بام و در خامشی کے بوجھ سے چور وغیرہ اسی زمانے سے متعلق ہیں۔

ایم۔ اے میں پہنچے تو کبھی کلاس میں جانے کی ضرورت ہوئی کبھی بالکل جی نہ چاہا۔ دوسری کتابیں جو نصاب میں نہیں تھیں پڑھتے رہے اس لیے امتحان میں کوئی خاص اعزاز حاصل نہیں کیا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ جو لوگ اوّل دوم آتے ہیں ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں خواہ ہمارے نمبر ان سے کم ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ بات ہمارے اساتذہ بھی جانتے تھے جب کسی اُستاد کا' جیسے پروفیسر ڈکنسن یا پروفیسر ہربنس چندر کٹاپالیا تھے' لیکچر دینے کو جی نہ چاہتا تو ہم سے کہتے کہ ہمارے بجائے تم لیکچر دو۔ ایک ہی بات ہے۔ البتہ پروفیسر بخاری بڑے قاعدے کے پروفیسر تھے۔ وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر ڈکنسن کے ذمے اُنیسویں صدی کا نثری ادب تھا مگر انھیں اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے ہم سے کہا دو تین لیکچر تیار کر لو۔ دوسرے جو دو تین لائق لڑکے ہمارے ساتھ تھے ان سے بھی کہا دو دو تین تین لیکچر تم لوگ بھی تیار کر دو۔ کتابوں وغیرہ کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو آکے ہم سے پوچھ لینا۔ چنانچہ نیم اُستاد ہم اسی زمانے میں ہو گئے تھے۔

ابتدائی شاعری کے دوران میں یا کالج کے زمانے میں ہمیں کوئی خیال ہی نہ گزرا کہ ہم شاعر بنیں گے۔ سیاست وغیرہ تو اس وقت ذہن میں بالکل ہی نہ تھی۔ اگرچہ اس وقت کی تحریکوں' مثلاً کانگریس تحریک' خلافت تحریک یا بھگت سنگھ کی دہشت پسند تحریک کے اثرات تو ذہن میں تھے۔ مگر ہم خود ان میں سے کسی قصے میں شریک نہیں تھے۔



شروع میں خیال ہوا کہ ہم کوئی بڑے کرکٹر بن جائیں کیونکہ لڑکپن سے کرکٹ کا شوق تھا اور بہت کھیل چکے تھے۔ پھر جی چاہا اُستاد بننا چاہیے۔ ریسرچ کرنے کا شوق تھا۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہ بنی۔ ہم کرکٹر بنے نہ نقاد اور نہ ریسرچ کیا۔ البتہ اُستاد ہو کر امرتسر چلے گئے۔

ہماری زندگی کا شاید سب سے خوش گوار زمانہ امرت سر ہی کا تھا اور کئی اعتبار سے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ جب ہمیں پہلی دفعہ پڑھانے کا موقع ملا تو بہت لطف آیا اپنے طلبہ سے دوستی کا لطف۔ ان سے ملنے اور روزمرّہ کی رسم و راہ کا لطف' اُن سے کچھ سیکھنے اور اُنھیں پڑھانے کا لطف۔ ان لوگوں سے دوستی اب تک قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے میں کچھ سنجیدگی سے شعر لکھنا شروع کیا۔ تیسرے یہ کہ امرت سر ہی میں پہلی بار سیاست میں تھوڑی بہت بصیرت اپنے کچھ رفقا کی وجہ سے پیدا ہوئی جن میں محمود الظفر تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں تھیں' بعد میں ڈاکٹر تاثیر آگئے تھے۔ یہ ایک نئی دنیا ثابت ہوئی۔ مزدوروں میں کام شروع کیا۔ سول برٹیز کی ایک انجمن بنی تو اس میں کام کیا۔ ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو اس کی تنظیم میں کام کیا۔ ان سب سے ذہنی تسکین کا ایک بالکل نیا میدان ہاتھ آیا۔

ترقی پسند ادب کے بارے میں بحثیں شروع ہوئیں اور اُن میں حصّہ لیا۔ ادب لطیف کی ادارت کی پیش کش ہوئی تو دو تین برس اس کا کام کیا۔ اس زمانے میں لکھنے والوں کے دو بڑے گروہ تھے۔ ایک "ادب برائے ادب" والے' دوسرے ترقی پسند تھے۔ کئی برس تک ان دونوں کے درمیان بحثیں چلتی رہیں جس کی وجہ سے کافی مصروفیت رہی جو بجائے خود ایک بہت ہی دلچسپ اور تسکین دہ تجربہ تھا۔ برصغیر میں ریڈیو شروع ہوا۔ ریڈیو میں ہمارے دوست تھے۔ ایک

سید رشید احمد تھے جو ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل ہوئے۔ دوسرے سوم ناتھ چب تھے، جو آج کل ہندوستان میں شعبۂ سیاحت کے سربراہ ہیں۔ دونوں باری باری سے لاہور کے اسٹیشن ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ہم اور ہمارے ساتھ شہر کے دو چار اور ادیب ڈاکٹر تاثیر، حسرت، صوفی صاحب اور ہری چند اختر وغیرہ ریڈیو آنے جانے لگے۔ اس زمانے میں ریڈیو کا پروگرام ڈائرکٹر آف پروگرامز نہیں بناتا تھا۔ ہم لوگ مل کر بنایا کرتے تھے۔ نئی نئی باتیں سوچتے تھے اور ان سے پروگرام مرتب کرتے تھے۔ ان دنوں ہم نے ڈرامے لکھے، فیچر لکھے دو چار کہانیاں لکھیں، یہ سب ایک مستقل مشغلہ تھا۔ رشید جب دلّی چلے گئے تو ہم دہلی جانے لگے۔ وہاں نئے نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے لکھنے والے گروہوں سے شناسائی ہوئی۔ مجاز، سردار جعفری، جاں نثار اختر، جذبی اور مخدوم مرحوم سے ریڈیو کے توسط سے رابطہ پیدا ہوا جس سے دوستی کے علاوہ بصیرت اور سوجھ بوجھ میں طرح طرح کے اضافے ہوئے۔ وہ سارا زمانہ مصروفیت کا بھی تھا اور ایک طرح سے بے فکری کا بھی۔

(ناتمام)



# فیض سے میری پہلی ملاقات

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

۱۹۲۱ء تھا اور اکتوبر کا مہینہ۔ مجھے سنٹرل ٹریننگ کالج سے گورنمنٹ کالج میں آئے ہوئے کوئی تین ہفتے گزرے تھے۔ سابقہ درس گاہ کی خشک تدریسی فضا اور ضبط و نظم سے طبیعت گھٹی گھٹی سی تھی۔ نئے کالج میں آتے ہی طبیعت میں انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ ادب و شعر کا شوق پھر سے اُبھرا۔ چنانچہ "بزمِ سخن" کی وساطت سے ایک بڑے مشاعرے کی صدارت پروفیسر پطرس بخاری کے سپرد ہوئی۔ شام ہوتے ہی کالج کا ہال طلبہ سے بھر گیا۔ اسٹیج کے ایک طرف نیازمندانِ لاہور اپنی پوری شان سے براجمان تھے۔ مقابل میں لاہور کی تمام ادبی انجمنوں کے نمائندے صف آرا تھے۔ دونوں جانب سے خوش ذوقی اور ظریفانہ شگفتگی ایک دوسرے کا خیر مقدم کر رہی تھی۔

روایتی دستور کے مطابق صدر نے اپنے کالج کے طلبہ سے شعر پڑھانے کا اعلان کیا۔ دو ایک برخوردار آئے اور بڑے ادب و انکسار سے کلام پڑھ کر چلے گئے۔ اچانک ایک دُبلا پتلا، منحنی سا لڑکا اسٹیج پر نمودار ہوا۔ سیاہ رنگ، سادہ لباس، انداز میں متانت بلکہ خشونت، چہرے پر اجنبی ہونے کا شدید احساس۔ ادھر

اُدھر کچھ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اتنے میں اس نے کہا: عرض کیا ہے۔ کلام میں ابتدائے مشق کے باوجود پختگی اور اسلوب میں برجستگی تھی۔ سب نے داد دی۔ یہ حفیظ ہوشیار پوری تھے۔

پھر ایک نوجوان آئے، گورے چٹے، کشادہ جبیں، حرکات میں شیریں روانی، آنکھیں اور لب بیک وقت ایک نیم تبسم میں ڈوبے ہوئے۔ شعر بڑے ڈھنگ اور تمکنت سے پڑھے۔ اشارے ہوئے، پطرس نے کچھ معنی خیز نظروں میں لاہور کے نیاز مندوں سے باتیں کیں اور ان کی نیم خاموشی کو رضا سمجھ کر دونوں نوجوانوں کو دوبارہ اسٹیج پر بلایا۔ نیا کلام سُنا۔ فیض صاحب نے غزل کے علاوہ ایک نظم بھی سنائی۔ غزل اور نظم دونوں میں سوچ کا انداز اور بیان کا اچھوتا اسلوب تھا۔

مشاعرہ ختم ہوا۔ قرار پایا کہ احباب ان دونوں کو ہمراہ لے کر غریب خانے پر جمع ہوں۔ رات کافی گزر چکی تھی، انھیں بورڈنگ میں پہنچنا تھا۔ بخاری صاحب نے ان کی غیر حاضری کا ذمہ لیا اور پھر گھنٹہ بھر کے لیے شعر و سخن کی صحبت قائم رہی۔ یہ ان کی طبع آزمائی کا امتحان نہیں، اساتذہ کی حوصلہ افزائی کا امتحان تھا۔ دونوں کامیاب رہے۔

ابھی پورا مہینہ نہیں گزرا تھا کہ کالج کے امتحانات کا آغاز ہوا۔ جس دن کی میں بات کر رہا ہوں اس دن پطرس کالج ہال میں مہتمم امتحانات تھے اور ہم جیسے نو تجربوں کو چھوٹے کمرے سپرد کیے گئے تھے۔ مجھے کالج کی دوسری منزل میں متعین کیا گیا۔ یہاں ایم۔اے انگلش کے طلبہ تھے اور ان میں فیض احمد فیض بھی تھے۔

امتحان کا کمرہ مقامِ احترام ہوتا ہے۔ امیدواروں کے ذہنی امتحان کے ساتھ ساتھ ضبط و نظم کا امتحان بھی ہوتا ہے۔ سگریٹ نوشی ممنوع تھی۔ میں نے



اپنی عادت کو دبانے کے لیے پان کا انتظام کر لیا تھا۔ مگر فیض صاحب کبھی سوالات کے پرچے پر نظر ڈالتے اور کبھی میری طرف نیم تبسم نظروں سے دیکھتے اور پھر قلم کو اُٹھا کر سر کو کھجاتے اور کبھی خاموشی سے اپنے پڑوسیوں کی مزاج پُرسی کرتے، کبھی کبھی ان کا بایاں ہاتھ ایسے حرکت کرتا جیسے وہ کسی نا معلوم شئے کو ٹٹول رہے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا۔ وہ اُٹھے اور کہا کہ ہمیں یہاں سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟ میں نے کہا میں ابھی بتاتا ہوں۔

اتنے میں پطرس مختلف کمروں کا معائنہ کرتے کرتے میرے کمرے کے باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں تعظیماً پلیٹ فارم سے اُتر کر دروازے پر پہنچا، پوچھا:

"سب کچھ ٹھیک ہے؟"

میں نے کہا "جی!"

میں نے عرض کیا: "پروفیسر صاحب (میں انھیں پروفیسر صاحب کہا کرتا تھا) بعض طلبہ سگریٹ پینا چاہتے ہیں۔ اجازت ہے؟"

پطرس نے میرے کان میں دبی آواز میں کہا:

"جب تک پروفیسر جودھ سنگھ اس کالج کے پرنسپل نہیں بنتے۔ اس وقت تک پی سکتے ہیں۔" اور پھر مسکرا کر چلے گئے۔

میں نے اندر آتے ہی فیض صاحب کی طرف دیکھا اور اشاروں سے سگریٹ نوشی کا اعلان کیا۔ فیض صاحب کے ہاتھ میں فی الفور ایک سگریٹ نمودار ہوا۔ جیسے قلم ہی سے اُبھر آیا ہو۔

پھر قلم کے رَشش اور سگریٹ کے کش میں مقابلہ شروع ہوا اور اس کش مکش میں معطر دھوئیں کے غبارے پورے کمرے میں پھیل گئے۔ میں معلّم تھا، ضبط و نظم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا بیٹھا رہا اور قوام دار پان کو چھوڑ کر اس

خوشبو سے اپنے ذوقِ سگریٹ نوشی کی تسکین میں محو ہوگیا۔

کیا معلوم تھا کہ دھوئیں کے یہ غبارے کالج کی چار دیواری سے دور دور تک فضا میں پھیل جائیں گے اور ان میں سگریٹ پینے والے کے معطر انفاس کی خوشبوئیں بھی لہرائیں گی اور ہنر وفن اور ادب کی دنیا کو اپنے آغوش میں لے لیں گی۔



# فیض سے میری رفاقت

## شیر محمد حمید

۱۹۲۹ء کی بات ہے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تیسرے سال کا طالب علم تھا۔ چودھری نبی احمد اور آغا عبدالحمید میرے دوست تھے۔ ہم سب نیو ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ہر شام ہم سیر کو نکلتے تو ایک نوجوان کو دیکھتے جو باہر جنگلے کے پاس تنہا کھڑا گرد وپیش سے بے خبر کالج ٹاور کی سمت نظریں جمائے، دور کہیں افق کی بلندیوں کو دیکھ رہا ہوتا۔ اس کا سراپا دلکش اور محویت جاذبِ توجہ۔ تین چار دنوں کے بعد نبی احمد کے ذوقِ جستجو نے ہمیں اُس نوجوان سے ہمکلام ہونے پر آمادہ کرلیا۔ قریب جاکر نبی احمد نے پوچھا "معاف کیجیے گا آپ کون ہیں اور یوں گم سم تنہا کھڑے کیا دیکھا کرتے ہیں؟" نوجوان محویت کے عالم سے چونکا اور کہنے لگا "میرا نام فیض ہے۔ میں نے مرے کالج سیالکوٹ سے ایف اے پاس کرکے یہاں تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا ہے۔ یہاں میرا کوئی واقف آشنا نہیں ہے۔" نبی احمد نے معاً کہا "آئیے آج سے آپ ہمارے دوست ہیں، یہ شیر محمد حمید ہیں۔ یہ آغا حمید ہیں، یہ بھی آپ کے ہم جماعت ہیں۔" وہ دن اور آج کا دن، ایک کم پچاس برس بیت چکے ہیں، زندگی ہزاروں نشیب وفراز سے گزری، فیض کی دوستی کا وہ بندھن بدستور برقرار ہے اور

یہ دوستی ہمارے لیے فخر و مسرت کا باعث رہی ہے۔

فیض کے والد خان بہادر سلطان محمد خاں سیالکوٹ کے سرکردہ وکیل، معزز و مخیّر شہری، ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین تھے۔ وجاہت و شرافت کا پیکر تھے، گھر میں ہر طرح کی آسودگی تھی۔ فیض نے ناز و نعمت میں آنکھ کھولی تھی، لاڈ پیار میں پرورش اور گھریلو رکھ رکھاؤ اور ناز برداریوں میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ لاہور آئے تو ماحول مختلف پایا۔ کچھ گھٹے گھٹے رہتے۔ ہمیں کافی جدوجہد کرنا پڑی کہ فیض اپنے خول سے باہر نکلیں چھ سات ماہ کے بعد ہم کامیاب ہوئے اور فیض حلقۂ احباب میں چہچہانے لگے۔

وہ زمانہ گورنمنٹ کالج کا سُنہری دَور تھا۔ بڑے بڑے نامور اساتذہ مختلف شعبوں کے سربراہ تھے۔ پروفیسر لینگ ہارن انگریزی کے صدر شعبہ تھے۔ تھرڈ ایئر کے امتحان میں انھوں نے ہمارے انگریزی کے پرچے دیکھے۔ پرچے واپس ملے تو فیض کے پرچے پر ایک سو پینسٹھ نمبر درج تھے، کسی طالب علم نے پروفیسر صاحب سے پوچھا ان کو ڈیڑھ سو میں سے ایک سو پینسٹھ نمبر کیسے مل گئے؟

جواب ملا: Because I couldn't give more.

فیض کی انگریزی دانی کے متعلق ایک نامور انگریز استاد کے یہ الفاظ سند رہیں گے۔

انہی دنوں پطرس بخاری کیمبرج سے فارغ التحصیل ہو کر گورنمنٹ کالج آئے۔ کالج کی علمی و ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ بخاری اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کی دلفریب شخصیت کا پرتو کالج کے ہر شعبے پر پڑا۔ کالج میں "بزمِ سخن" نام کی ایک اُردو انجمن موجود تھی۔ اس کے اجلاس مشاعروں اور رسمی تقاریب تک محدود تھے۔ بخاری صاحب نے ناکافی سمجھ کر "مجلس" کے نام سے ایک نئی



انجمن کا اجرا کیا۔ اُردو ادب سے شغف رکھنے والے طلبہ کو چُن چُن کر اس کا رُکن بنایا۔ فیض، راشد، آغا حمید، نبی احمد، حفیظ ہوشیارپوری اور یہ خاکسار اس کے بانی اراکین میں سے تھے۔ طالب علموں کے علاوہ بخاری صاحب کے ایما اور دعوت پر لاہور کے برگزیدہ ادیب و دانشور شریکِ مجلس ہوتے۔ ڈاکٹر تاثیر، مولانا سالک، امتیاز علی تاج، صوفی تبسم، چراغ حسن حسرت، بالالتزام اور حفیظ جالندھری کبھی کبھار تشریف لاتے۔ اجلاس اکثر و بیشتر بخاری کے دولت کدے پر ہوتے۔ ایک طالب علم مقالہ پڑھتا، ایک دو نظم یا غزل پیش کرتے، پھر سوال و جواب، تنقید و تبصرے کا دَور چلتا۔ صاحبِ مقالہ کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی اور نئے نئے گوشوں کی طرف رہنمائی بھی۔ موضوع کے ہر پہلو کو کھنگالا جاتا۔ اور مشرق و مغرب کے اسالیبِ تنقید، قدیم و جدید اصولوں کے معیار پر پرکھا جاتا۔ غرض کوئی زاویہ، کوئی پہلو نظر انداز نہ کیا جاتا۔ اس دوران زمامِ بحث اکثر بخاری کے چابکدست ہاتھوں میں رہتی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کی یہ نشست مہینوں کی دیدہ ریزی پر حاوی ہوتی۔ ہم لوگ انشراحِ قلب کی کیفیت لیے واپس لوٹتے۔ یہ بخاری کی کرشمہ زائی تھی کہ مدفون امکانات کو اُجاگر کر کے فیض اور راشد جیسے نامور اکابر مجلس نے پیدا کیے۔

فیض میں شاعری کا مادّہ فطری و وہبی تھا۔ ہم لوگوں میں بھی فیض کی صحبت اور بخاری، تاثیر اور تبسم جیسے جیّد اساتذہ کے التفاتِ نظر کے باعث شعر و ادب سے کچھ لگن پیدا ہو گئی۔ احباب کا حلقہ وسیع ہو چکا تھا۔ ہر شام ہوسٹل کے کسی کمرے میں محفلِ مشاعرہ برپا کر بیٹھتے۔ طرح مصرع پر ہر کوئی دو چار شعر لکھ کر لاتا۔ محفل کے اختتام پر ہر غزل میں شعر انتخاب کر کے ایک غزل مرتّب تیار کر لیتے جو کالج کے مجلہ راوی میں "احباب" کے نام سے چھپتی۔ ظاہر ہے اس غزلِ مرتّب

میں حصۂ وافر فیض کا ہوتا۔ "دی احباب" کے عنوان سے ایک طنزیہ فیض نے راوی میں لکھا تھا جواب اُن کی کتاب "متاعِ لوح و قلم" میں شامل ہے۔

فیض کی شاعری پروان چڑھتی رہی۔ بین الکلیاتی مشاعروں میں فیض اکثر انعامات سمیٹتے رہے۔ ابھی کالج کا زمانہ تھا کہ فیض صفِ شاگرداں سے اُٹھ کر مجلسِ اساتذہ میں شریک ہو گئے اور بخاری، تاثیر اور تبسم کے احباب میں جگہ پالی۔

ہم فورتھ ایئر میں تھے۔ دسمبر کی چھٹیوں میں فیض کی ہمشیرہ کی شادی تھی، وہ سیالکوٹ چلے گئے۔ اُن کے والد اس تقریب کی تیاری میں مصروف تھے۔ جس صبح برات کو آنا تھا اُسی رات حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اُن کا انتقال ہو گیا۔ اس قیامت کا اندازہ کیجیے جو اس ناگہانی موت سے ان کے خاندان پر گزر گئی۔ فیض نے ایک فقرہ کا خط لکھا: "تمھارا فیض یتیم ہو گیا"۔ اِن حشر سامانیوں کو کون سمجھے جو اس ایک فقرہ کی تہہ میں موجود ہیں۔ اس سانحۂ عظیم نے گویا زندگی کی بساط اُلٹ دی۔ فیض کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ اس کے قلب و ذہن میں ایک انقلاب آ گیا۔ یہاں سے اس کی سوچ اور فکر کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری نے بھی نیا رُخ اختیار کیا۔ غمِ جاناں کے ساتھ غمِ روزگار کا جاں گسل پیوند لگ جانے سے سوچ کے دھارے نئی سمت میں بہنے لگے۔

فیض نے انگریزی اور عربی میں ایم۔اے کر لینے کے بعد ایم۔اے۔او کالج میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ وہاں ڈاکٹر تاثیر بطور پرنسپل اور صاحبزادہ محمود الظفر بطور وائس پرنسپل آ گئے۔ صاحبزادہ کی معروف رفیقۂ حیات ڈاکٹر رشید جہاں اور اُن کے زمرے کے دوسرے لوگوں سے میل جول بڑھا تو فکر و نظر کو اور وسعت ملی۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا اجرا انہی دنوں ہوا۔ فیض اس کے بانی رُکن ہیں۔ اب وہ غمِ جاناں اور غمِ روزگار سے گزر کر غمِ وطن



اور غمِ جہاں کی سنگلاخ راہوں پر چل نکلے۔ اپنی ذات کا دُکھ عالمگیر دُکھ کے سامنے ہیچ اور اس آفاقی دُکھ کا ایک معمولی حصہ نظر آیا۔ فیض وطن دوستی اور انسان دوستی کی جس راہ پر گامزن ہوئے اس میں ہزار آفتوں کا سامنا تھا۔ جسم و جاں کی قربانیاں درکار تھیں۔ الحمدللہ کہ فیض کسی مصیبت کا سامنا کرنے سے نہیں ہچکچایا۔ نگارِ وطن کی حُرمت آزادی اور پھر تزئین و تجمیل کے شوق نے جس جس قربانی کا تقاضا کیا، پیش کر دی۔ یہ راہ طویل بھی ہے اور کٹھن بھی، لیکن راہروِ عشق کے قدموں میں نہ لغزش آئی اور نہ تھکن محسوس کی۔

تحریکِ آزادی کا یہ جیالا تحریکِ پاکستان کے معرکوں میں بھی ہراول رہا۔ پاکستان ٹائمز کے اجرا پر مدیرِ اعلیٰ مقرر ہوا تو صحافتی محاذ پر قلمی جہاد کے معرکے سر کرتا رہا۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو تعمیرِ وطن کے مراحل سامنے آئے۔ جب پاکستان کے خواب دیکھے تھے۔ ان کی تعبیر حسبِ مراد نظر نہ آئی تو احتجاج کی صدا بلند کی۔ اور اربابِ اقتدار کو یہ طرزِ نوا پسند نہ آئی تو سازش کیس میں دھر لیے گئے، اور قید و بند کے مصائب جھیلنا پڑے۔ سازش کیس کا معما کیا تھا؟ اس کے متعلق نہ کبھی ہم نے دریافت کیا اور نہ ہی فیض نے بتایا۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری تھی

اچانک گرفتاری، خوف و دہشت کی فضا، قیدِ تنہائی اور پھر سنٹرل جیل میں مقدمے کی سماعت، عجب گوگو کا عالم تھا۔ فیض کے اعزہ اور اقربا دوست احباب سب پریشان تھے۔ فیض کے بڑے بھائی حاجی طفیل احمد جو میرے بھی کرمفرما تھے، حیدرآباد جیل میں فیض سے مُلاقات کو گئے اور وہیں حرکتِ قلب رُک جانے

سے انتقال کر گئے۔ میں تعزیت اور دلجوئی کے لیے فیض سے ملنے حیدر آباد گیا۔ جیل کے اندر ملاقات ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ مقدمے کی سنگینی، جیل کی مصیبت اور اب شفیق بھائی کی ناگہانی موت نے فیض کو سخت مضمحل اور بدحال کر رکھا ہوگا۔ میں یہ دیکھ کر متعجب رہ گیا کہ فیض کی ظاہری شکل و صورت میں کسی غیر معمولی تبدیلی کے آثار نظر نہ آئے۔ اضمحلال و پریشانی کا کوئی خاص نشان نہ تھا۔

فیض ٹھنڈے مزاج کے بے حد صلح پسند آدمی ہیں، بات کتنی بھی اشتعال انگیز ہو، حالات کتنے بھی ناسازگار ہوں وہ نہ برہم ہوتے ہیں اور نہ مایوس۔ سب کچھ تحمل اور خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں، نہ کوئی شکوہ نہ کسی کا گلہ نہ چڑچڑاہٹ نہ بدگوئی۔ میں نے فیض کو نہ کبھی طیش میں دیکھا ہے اور نہ کبھی کسی کا شکوہ شکایت کرتے سنا ہے۔ ان کے دل کی گہرائیوں میں لاکھ ہیجان برپا ہوں، چہرے پر برہمی کی یا پریشانی کی کوئی لکیر نظر نہ آئے گی۔ فیض کا ظرف کتنا وسیع ہے؟ سمندر کی تہہ میں طوفانوں کی رستخیز ہے، سطح پرسکون ہے۔ یہ عظمت ہر کسی کو کہاں نصیب!

ہر معتدل آدمی کی طرح فیض پر بھی عشق و محبت کے حادثے گزرے ہیں۔ کچھ عام نوعیت کے رومانی واقعات جن کا دیرپا اثر فیض کی زندگی اور شاعری پر نہیں پڑا۔ لیکن دو ایک وارداتیں اس قدر شدید تھیں کہ فیض کے قلب و جگر کو برما کے رکھ گئیں۔ "نقشِ فریادی" کی نظمیں رقیب سے، ایک راہ گزر پر، ایسے ہی حادثے کی یادگار ہیں جس کا اختتام مرگِ سوزِ محبت پر ہوا۔ ایسے حادثے ہر کسی پر گزرتے ہیں لیکن فیض جیسے حسن بیں اور حسن آفریں حساس فن کار پر ان کے جو گہرے اثرات مترتب ہوئے ان کا سراغ جا بجا ان کی شعری تخلیقات میں مل جاتا ہے۔



میرے نزدیک فیض کی زندگی کے اہم ترین واقعات میں ایلس جارج سے ان کی شادی ہے۔ یہ بظاہر ایک مشرقی نوجوان کا ایک فرنگی نژاد خاتون سے نکاح ہے۔ ایسے نکاح آئے دن ہوتے رہتے ہیں، لیکن حقیقتاً یہ مشرقی قلب و روح اور مغربی جسم و دل کا وہ بارآور پیوند ہے جس نے مشرق و مغرب کی رعنائیاں یک جا کر دی ہیں۔ فیض ایک لاابالی بے نیازِ این و آں اور خود فراموش سا نوجوان تھا۔ ایلس نے اس کی زندگی میں تربیت اور سنوار پیدا کر دی۔ اس کی بے قرار روح کو ایک حسین قالب میسر آگیا۔ ایلس نے مغرب اور اس کی تہذیبی روایات کو خیرباد کہہ کر مشرق اور اس کی ثقافتی اقدار کو اپنا لیا۔ دیس کے ساتھ بھیس اور وطن کے ساتھ زبان تک بدل لی۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ایلس نے فیض کے فکر و نظر، جذبات و حیات اور آدرش تک اپنا لیے۔ قید و بند کی جن جن آزمائشوں سے فیض گزرے ہیں، ایلس کی غم خواری اور حوصلہ مندی کے بغیر ان جان لیوا مراحل سے یوں اعتماد اور یقینِ محکم کے ساتھ گزرنا مشکل ہوتا۔

فیض کا پیدائشی شہر سیالکوٹ ہے۔ رہائشی شہر لاہور کہہ لیجیے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ لائل پور سے بھی ان کو نسبتِ خاص ہے۔ ان کی جوانی کی کئی حسین یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں ان کے مدّاح اور پرستار ملک کے اندر اور باہر ہر جگہ موجود ہیں لیکن لائل پور کے باسی ان سے دوگونہ التفات کے مستحق ہیں۔ اس لیے یہ آرزو کرنا کوئی بڑی جسارت نہ ہوگی کہ فیض ہمیں دل کے کسی محفوظ اور مخصوص گوشے میں جگہ دیے رکھیں۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

اقبالؔ



# اشعار

جو پیرہن میں کوئی تار محتسب سے بچا
درازدستیٔ پیرِ مغاں کی نذر ہوا
اگر جراحتِ قاتل سے بخشوا لائے
تو دل سیاستِ چارہ گراں کی نذر ہوا

## جس روز قضا آئے گی

کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اِس طرح کہ جس طور کبھی اوّلِ شب
بے طلب پہلے پہل مرحمتِ بوسۂ لب
جس سے کھلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در
اور کہیں دور سے انجان گلابوں کی بہار
یک بیک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے





### ۲

شاید اس طرح کہ جس طور کبھی آخرِ شب
نیم وا کلیوں سے سرسبز سحر
یک بیک حجرۂ محبوب میں لہرانے لگے
اور خاموش دریچوں سے بہ ہنگامِ رحیل
جھنجھناتے ہوئے تاروں کی صدا آنے لگے

کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اس طرح کہ جس طور تہِ نوکِ سناں
کوئی رگ واہمۂ درد سے چلّانے لگے
اور قزاقِ سناں دست کا دھندلا سایہ
از کراں تا بہ کراں دہر پہ منڈلانے لگے

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرفِ وداع کی صورت
للہِ الحمد بانجامِ دلِ دل زدگاں
کلمۂ شکر بنامِ لبِ شیریں دہناں

۱۹۷۲ء



○

ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے
ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے

رنگ و خوشبو کے، حسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

تیرے قول و قرار سے پہلے
اپنے کچھ اور بھی سہارے تھے

جب وہ لعل و گہر حساب کیے
جو ترے غم نے دل پہ وارے تھے

میرے دامن میں آگرے سارے
جتنے طشتِ فلک میں تارے تھے

عمرِ جاوید کی دعا کرتے
فیض اتنے وہ کب ہمارے تھے

۱۹۷۲ء





## قطعہ

ہزار درد شبِ آرزو کی راہ میں ہے
کوئی ٹھکانہ بتاؤ کہ قافلہ اُترے
قریب اور بھی آؤ کہ شوقِ دید مٹے
شراب اور پلاؤ کہ کچھ نشہ اُترے

## اشک آباد[1] کی شام

جب سورج نے جاتے جاتے
اشک آباد کے نیلے اُفق سے
اپنے سنہری جام
میں ڈھالی
سرخیٔ اوّلِ شام
اور یہ جام
تمھارے سامنے رکھ کر
تم سے کیا کلام

[1] اشک آباد ترکمان جمہوریہ کا صدر مقام ہے۔





کہا پرنام
اُٹھو
اور اپنے تن کی سیج سے اُٹھ کر
اِک شیریں پیغام
ثبت کرو اس شام
کسی کے نام
کنارِ جام
شاید تم یہ مان گئیں اور تم نے
اپنے لبِ گلفام
کیے انعام
کسی کے نام
کنارِ جام
یا شاید
تم اپنے تن کی سیج پہ سج کر

تھیں یوں محوِ آرام
کہ رستہ تکتے تکتے
بجھ گئی شمعِ جام
اشک آباد کے نیلے اُفق پر
غارت ہو گئی شام

۱۹۷۲ء





# مرے درد کو جو زباں ملے

مرا درد نغمۂ بے صدا
مری ذات ذرّۂ بے نشاں
مرے درد کو جو زباں ملے
مجھے اپنا نام و نشاں ملے
مری ذات کا جو نشاں ملے
مجھے رازِ نظمِ جہاں ملے
جو مجھے یہ رازِ نہاں ملے
مری خامشی کو بیاں ملے
مجھے کائنات کی سروری
مجھے دولتِ دو جہاں ملے

۱۹۷۳ء

## پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو



ہم کیا کرتے کس رہ چلتے
ہر راہ میں کانٹے بکھرے تھے
اُن رشتوں کے جو چھوٹ گئے
اُن صدیوں کے یارانوں کے
جو اِک کر کے ٹوٹ گئے
جس راہ چلے، جس سَمت گئے
یوں پاؤں لہولہان ہوئے



سب دیکھنے والے کہتے تھے
یہ کیسی ریت رچائی ہے
یہ مہندی کیوں لگائی ہے
وہ کہتے تھے، کیوں قحطِ وفا
کا ناحق چرچا کرتے ہو
پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو!
یہ راہیں جب اَٹ جائیں گی
سو رستے اِن سے پھوٹیں گے
تم دل کو سنبھالو جس میں ابھی
سو طرح کے نشتر ٹوٹیں گے

۱۹۷۳ء

## سجاد ظہیر کے نام

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوست داری
نہ غمہائے وطن پر اشکباری
سنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر
نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر





"بنامِ شاہدِ نازک خیالاں"
بیادِ مستیِ چشمِ غزالاں
بنامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بیادِ کلفتِ ایامِ زنداں
صبا اور اس کا اندازِ تکلّم
سحر اور اس کا آغازِ تبسّم
فضا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے
سحر گہ اب اسی کے نام ساقی
کریں اتمامِ دورِ جامِ ساقی
بساطِ بادہ و مینا اٹھا لو
بڑھا دو شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جامِ الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

دہلی۔ ستمبر ۱۹۷۳ء

# اے شامِ مہرباں ہو!



اے شامِ مہرباں ہو
اے شامِ شہرِ یاراں

ہم پہ مہرباں ہو
دوزخی دوپہر ستم کی
بے سبب ستم کی

دوپہر درد و غیظ و غم کی
بے زباں درد و غیظ و غم کی
اس دوزخی دوپہر کے تازیانے



آج تن پر دھنک کی صورت
قوس در قوس بٹ گئے ہیں
زخم سب کھل گئے ہیں جن کے
داغ جانا تھا چھٹ گئے ہیں
ترے توشے میں کچھ تو ہو گا
مرہم درد کا دوشالہ
تن کے اس انگ پہ اڑھا دے
درد سب سے سوا جہاں ہو
اے شامِ مہرباں ہو
اے شامِ شہرِ یاراں
ہم پہ مہرباں ہو

دوزخی دشت نفرتوں کے
بے درد نفرتوں کے

کرچیاں دیدۂ حسد کی
خس و خاشاک رنجشوں کے
اتنی سنسان شاہراہیں
اتنی گنجان قتل گاہیں
جن سے آئے ہیں ہم گزر کر
آبلہ بن کے ہر قدم پر
یوں پاؤں کٹ گئے ہیں
رستے سمٹ گئے ہیں
مخملیں اپنے بادلوں کی
آج پاؤں تلے بچھا دے
شافیِ کربِ رہرواں ہو
اے شام مہرباں ہو



اے مہرِ شب نگاراں
اے رفیقِ دلفگاراں
اس شام ہم زباں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شام شہریاراں
ہم پہ مہرباں ہو

۱۹۷۴ء

# گیت

چلو پھر سے مسکرائیں
چلو پھر سے دل جلائیں
جو گزر گئی ہیں راتیں
انھیں پھر جگا کے لائیں
جو بسر گئی ہیں باتیں
انھیں یاد میں بُلائیں

چلو پھر سے دل لگائیں
چلو پھر سے مسکرائیں





کسی شہ نشیں پہ جھلکی
وہ دھنک کسی قبا کی
کسی رگ میں کسمسائی
وہ کسک کسی ادا کی
کوئی حرفِ بے مروّت
کسی کُنجِ لب سے پھوٹا
وہ چھنک کے شیشۂ دل
تہِ بام پھر سے ٹوٹا
یہ مِلن کی نا مِلن کی —
یہ لگن کی اور جلن کی
جو سہی ہیں وارداتیں
جو گزر گئی ہیں راتیں
جو بسر گئی ہیں باتیں

کوئی ان کی دُھن بنائیں
کوئی ان کا گیت گائیں
چلو پھر سے مسکرائیں
چلو پھر سے دل جلائیں

۱۹۷۴ء





# ہم تو مجبور تھے اِس دل سے

ہم تو مجبور تھے اس دل سے کہ جس میں ہر دم
گردشِ خوں سے وہ کہرام بپا رہتا ہے
جیسے رندانِ بلانوش جو مل بیٹھیں بہم
میکدے میں سفرِ جام بپا رہتا ہے
سوزِ خاطر کو ملا جب بھی سہارا کوئی
داغِ حرمان کوئی دردِ تمنا کوئی
مرہمِ یاس سے مائل بہ شفا ہونے لگا
زخمِ اُمید کوئی پھر سے ہرا ہونے لگا

ہم تو مجبور تھے اس دل سے کہ جس کی ضد پر
ہم نے اُس رات کے ماتھے پہ سحر کی تحریر
جس کے دامن میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا
ہم نے اس دشت کو ٹھہرا لیا فردوس نظیر
جس میں جُز صنعتِ خونِ سرِ پا کچھ بھی نہ تھا
دل کو تعبیر کوئی اور گوارا ہی نہ تھی
کلفتِ زیست تو منظور تھی ہر طور مگر
راحتِ مرگ کسی طور گوارا ہی نہ تھی





○

نہ اب رقیب نہ ناصح نہ غم گسار کوئی
تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا

جدا تھے ہم تو میسر تھیں قربتیں کتنی
بہم ہوئے تو پڑی ہیں جدائیاں کیا کیا

پہنچ کے در پہ ترے کتنے معتبر ٹھہرے
اگرچہ رہ میں ہوئیں جگ ہنسائیاں کیا کیا

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

ستم پہ خوش، کبھی لطف و کرم سے رنجیدہ
سکھائیں تم نے ہمیں کج ادائیاں کیا کیا

۱۹۷۴ء

# ڈھاکہ سے واپسی پر

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد

اُن سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

۱۹۷۴ء



○

یہ موسمِ گل گرچہ طرب خیز بہت ہے
احوالِ گل و لالہ غم انگیز بہت ہے

خوش دعوتِ یاراں بھی ہے یلغارِ عدو بھی
کیا کیجیے دل کا جو کم آمیز بہت ہے

یوں پیرِ مغاں شیخِ حرم سے ہوئے یک جاں
میخانے میں کم ظرفیِ پرہیز بہت ہے

اک گردنِ مخلوق جو ہر حال میں خم ہے
اک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے

کیوں مشعلِ دل فیض چھپاؤ تہِ داماں!
بجھ جائے گی یوں بھی کہ ہوا تیز بہت ہے

۱۹۷۵ء

## بہار آئی

بہار آئی تو جیسے یکبار
لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے، شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پہ مر مٹے تھے
جو مٹ کے ہر بار پھر جیے تھے
نکھر گئے ہیں گلاب سارے
جو تیری یادوں سے مشکبو ہیں
جو تیرے عشاق کا لہو ہیں





اُبل پڑے ہیں عذاب سارے
ملالِ احوالِ دوستاں بھی
خمارِ آغوشِ مہ وشاں بھی
غبارِ خاطر کے باب سارے
ترے ہمارے
سوال سارے، جواب سارے
بہار آئی تو کھل گئے ہیں
نئے سرے سے حساب سارے

اپریل ۱۹۷۵ء

# تم اپنی کرنی کر گزرو

اب کیوں اُس دن کا ذکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
جو کچھ پایا کھو جائے گا
جو مل نہ سکا وہ پائیں گے



یہ دن تو وہی پہلا دن ہے
جو پہلا دن تھا چاہت کا
ہم جس کی تمنا کرتے رہے
اور جس سے ہر دم ڈرتے رہے
یہ دن تو کتنی بار آیا
سو بار بسے اور اُجڑ گئے
سو بار لُٹے اور بھر پایا

اب کیوں اُس دن کی فکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
تم خوف و خطر سے درگزرو
جو ہونا ہے سو ہونا ہے

گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے

گر رونا ہے تو رونا ہے

تم اپنی کرنی کر گزرو

جو ہوگا دیکھا جائے گا

اکتوبر ۱۹۷۵ء



# موری اَرج سنو

(نذرِ خسرو)

"موری ارج سنو دست گیر پیر"

"مائی ری، کہوں کا سے میں

اپنے جیا کی پیر"

"نیا باندھو رے،

باندھو رے کنارِ دریا"

"مورے مندر اب کیوں نہیں آئے"

اس صورت سے

عرض سناتے

درد بتاتے

نیا کھیتے
منت کرتے
رستہ تکتے
کتنی صدیاں بیت گئی ہیں
اب جا کر یہ بھید کھُلا ہے
جس کو تم نے عرض گزاری
جو تھا ہاتھ پکڑنے والا
جس جا لاگی ناؤ تمھاری
جس سے دُکھ کا دارو مانگا
تورے مندر میں جو نہیں آیا
وہ تو تمھیں تھے
وہ تو تمھیں تھے

ستمبر ۱۹۷۵ء



○

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

مقابلِ صفِ اعدا جسے کیا آغاز
وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی

کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پسِ قتلِ عام ہوتی رہی

یہ برہمن کا کرم، وہ عطائے شیخِ حرم
کبھی حیات کبھی مے حرام ہوتی رہی

جو کچھ بھی بن نہ پڑا، فیضؔ لُٹ کے یاروں سے
تو رہزنوں سے دعا و سلام ہوتی رہی

○

تجھے پکارا ہے بے ارادہ
جو دل دُکھا ہے بہت زیادہ

ندیم ہو تیرا حرفِ شیریں
تو رنگ پر آئے رنگِ بادہ

عطا کرو اک ادائے دیریں
تو اشک سے تر کریں لبادہ

نہ جانے کس دن سے منتظر ہے
دلِ سرِ رہگزر فتادہ

کہ ایک دن پھر نظر میں آئے
وہ بامِ روشن، وہ درِ کشادہ

وہ آئے پرسش کو پھر سجائے
قبائے رنگیں، ادائے سادہ





○

حسرتِ دید میں گزراں ہیں زمانے کب سے
دشتِ اُمید میں گرداں ہیں زمانے کب سے

دیر سے آنکھ پہ اُترا نہیں اشکوں کا عذاب
اپنے ذمّے ہے ترا قرض نہ جانے کب سے

کس طرح پاک ہو بے آرزو لمحوں کا حساب
درد آیا نہیں دربار سجانے کب سے

سرکرو ساز کہ چھیڑیں کوئی دل سوز غزل
"ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے کب سے"

پُر کرو جام کہ شاید ہو اِسی لحظہ رواں
روک رکھّا ہے جو اِک تیر قضا نے کب سے

فیضؔ پھر کب کسی مقتل میں کریں گے آباد
لب پہ ویراں ہیں شہیدوں کے فسانے کب سے



## لینن گراڈ کا گورستان



سرد سلوں پر
زرد سلوں پر
تازہ گرم لہو کی صورت
گلدستوں کے چھینٹے ہیں
کتبے سب بے نام ہیں لیکن
ہر اِک پھول پہ نام لکھا ہے
غافل سونے والے کا

یاد میں رونے والے کا
اپنے فرض سے فارغ ہو کر
اپنے لہو کی تان کے چادر
سارے بیٹے خواب میں ہیں
اپنے غموں کا ہار پرو کر
اماں اکیلی جاگ رہی ہے۔

لینن گراڈ ۱۹۷۶ء



○

یہ کس خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا

غمِ جہاں ہو، رُخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

تھے خاکِ راہ بھی ہم لوگ قہرِ طوفاں بھی
سہا تو کیا نہ سہا اور کیا تو کیا نہ کیا

خوشا کہ آج ہر اک مدعی کے لب پر ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندۂ زمانہ کیا

وہ حیلہ گر جو وفا جُو بھی ہے جفا خُو بھی
کیا بھی فیضؔ تو کس بُت سے دوستانہ کیا

۱۹۷۶ء

# درِ اُمید کے دریوزہ گر

پھر پھریرے بن کے میرے تن بدن کی دھجیاں
شہر کے دیوار و در کو رنگ پہنانے لگیں
پھر کف آلودہ زبانیں مدح و ذم کی قمچیاں
میرے ذہن و گوش کے زخموں پہ برسانے لگیں

پھر نکل آئے ہوسناکوں کے رقصاں طائفے
دردمندِ عشق پر ٹھٹھے لگانے کے لیے
پھر دُہل کرنے لگے تشہیرِ اخلاص و وفا
کشتۂ صدق و صفا کا دل جلانے کے لیے



# کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام اُلجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

۱۹۷۶ء

ہم کہ ہیں کب سے درِ اُمید کے دریوزہ گر
یہ گھڑی گزری تو پھر دستِ طلب پھیلائیں گے
کوچہ و بازار سے پھر چُن کے ریزہ ریزہ خواب
ہم یونہی پہلے کی صورت جوڑنے لگ جائیں گے

مارچ ۱۹۷۷ء





# آج اِک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال

(۱)

آج اِک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال
مدھ بھرا حرف کوئی، زہر بھرا حرف کوئی
دل نشیں حرف کوئی، قہر بھرا حرف کوئی
حرفِ اُلفت کوئی دلدارِ نظر ہو جیسے
جس سے مِلتی ہے نظر بوسۂ لب کی صورت
اتنا روشن کہ سرِ موجۂ زر ہو جیسے
صحبتِ یار میں آغازِ طرب کی صورت
حرفِ نفرت کوئی شمشیرِ غضب ہو جیسے

تا اَبد شہرِ ستم جس سے تبہ ہو جائیں
اتنا تاریک کہ شمشان کی شب ہو جیسے
لب پہ لاؤں تو مرے ہونٹ سیہ ہو جائیں

(۲)

آج ہر سُر سے ہر اک راگ کا ناتا ٹوٹا
ڈھونڈتی پھرتی ہے مطرب کو پھر اُس کی آواز
جوششِ درد سے مجنوں کے گریباں کی طرح
چاک در چاک ہوا آج ہر اک پردۂ ساز
آج ہر موجِ ہَوا سے ہے سوالی خلقت
لا کوئی نغمہ، کوئی صَوت، تری عمر دراز
نوحۂ غم ہی سہی، شورِ شہادت ہی سہی
صورِ محشر ہی سہی، بانگِ قیامت ہی سہی

جولائی ۱۹۷۷ء



○

کس شہر نہ شہرہ ہوا نادانیِ دل کا
کس پر نہ کھُلا رازِ پریشانیِ دل کا
آؤ کریں محفل پہ زرِ زخم نمایاں
چرچا ہے بہت بے سروسامانیِ دل کا
دیکھ آئیں چلو کوئے نگاراں کا خرابہ
شاید کوئی محرم ملے ویرانیِ دل کا
پوچھو تو اِدھر تیر فگن کون ہے یارو
سونپا تھا جسے کام نگہبانیِ دل کا
دیکھو تو کدھر آج رُخِ بادِ صبا ہے
کس رہ سے پیام آیا ہے زندانیِ دل کا
اُترے تھے کبھی فیضؔ وہ آئینۂ دل میں
عالم ہے وہی آج بھی حیرانیِ دل کا

# اشعار

وہ بُتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روزِ قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اُٹھے تھے ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی، وہ وقارِ دستِ دعا گیا

جو طلب پہ عہدِ وفا کیا، تو وہ قدرِ رسمِ وفا گئی
سرِ عام جب ہوئے مدعی، تو ثوابِ صدق و صفا گیا



# فرمائشیں

# مرثیۂ امام

رات آئی ہے شبّیر پہ یلغارِ بلا ہے
ساتھی نہ کوئی یار نہ غم خوار رہا ہے
مونس ہے تو اِک درد کی گھنگھور گھٹا ہے
مُشفق ہے تو اک دل کے دھڑکنے کی صدا ہے
تنہائی کی، غربت کی، پریشانی کی شب ہے
یہ خانۂ شبّیر کی ویرانی کی شب ہے



دشمن کی سپہ خواب میں مدہوش پڑی تھی
پل بھر کو کسی کی نہ اِدھر آنکھ لگی تھی
ہر ایک گھڑی آج قیامت کی گھڑی تھی
یہ رات بہت آلِ محمّد پہ کڑی تھی
رہ رہ کے بُکا اہلِ حرم کرتے تھے ایسے،
تھم تھم کے دیا آخرِ شب جلتا ہے جیسے

اِک گوشے میں ان سوختہ سامانوں کے سالار
اِن خاک بسر، خانماں ویرانوں کے سردار
تشنہ لب و درماندہ و مجبور و دل افگار
اِس شان سے بیٹھے تھے شہِ لشکرِ احرار
مسند تھی، نہ خلعت تھی، نہ خدّام کھڑے تھے
ہاں تن پہ جدھر دیکھیے سو زخم سجے تھے

کچھ خوف تھا چہرے پہ نہ تشویش ذرا تھی
ہر ایک ادا مظہرِ تسلیم و رضا تھی
ہر ایک نگہ شاہدِ اقرارِ وفا تھی
ہر جنبشِ لب منکرِ دستورِ جفا تھی
پہلے تو بہت پیار سے ہر فرد کو دیکھا
پھر نام خدا کا لیا اور یوں ہوئے گویا

الحمد قریب آیا غمِ عشق کا ساحل
الحمد کہ اب صبحِ شہادت ہوئی نازل
بازی ہے بہت سخت میانِ حق و باطل
وہ ظلم میں کامل ہیں تو ہم صبر میں کامل
بازی ہوئی انجام، مبارک ہو عزیزو
باطل ہوا ناکام، مبارک ہو عزیزو



پھر صبح کی لَو آئی رخِ پاک پہ چمکی
اور ایک کرن مقتلِ خوںناک پہ چمکی
نیزے کی انی تھی خس و خاشاک پہ چمکی
شمشیر برہنہ تھی کہ افلاک پہ چمکی
دم بھر کے لیے آئینہ رو ہو گیا صحرا
خورشید جو اُبھرا تو لہو ہو گیا صحرا

پر باندھے ہوئے حملے کو آئی صفِ اعدا
تھا سامنے اِک بندۂ حق یکّہ و تنہا
ہر چند کہ ہر اک تھا اُدھر خون کا پیاسا
یہ رعب کا عالم کہ کوئی پہل نہ کرتا
کی آنے میں تاخیر جو لیلائے قضا نے
خطبہ کیا ارشاد امامِ شہدا نے

فرمایا کہ کیوں درپئے آزار ہو لوگو
حق والوں سے کیوں برسرِ پیکار ہو لوگو
واللہ کہ مجرم ہو، گنہگار ہو لوگو
معلوم ہے کچھ کس کے طرفدار ہو لوگو
کیوں آپ کے آقاؤں میں اور ہم میں ٹھنی ہے
معلوم ہے کس واسطے اس جاں پہ بنی ہے

سطوت، نہ حکومت، نہ حشم چاہیے ہم کو
اورنگ نہ افسر، نہ علم چاہیے ہم کو
زر چاہیے، نے مال و درم چاہیے ہم کو
جو چیز بھی فانی ہے وہ کم چاہیے ہم کو
سرداری کی خواہش ہے نہ شاہی کی ہوس ہے
اِک حرفِ یقیں، دولتِ ایماں ہمیں بس ہے





طالب ہیں اگر ہم تو فقط حق کے طلبگار
باطل کے مقابل میں صداقت کے پرستار
انصاف کے، نیکی کے، مروّت کے طرفدار
ظالم کے مخالف ہیں تو بے کس کے مددگار
جو ظلم پہ لعنت نہ کرے، آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں، وہ منکرِ دیں ہے

تا حشر زمانہ تمھیں مکار کہے گا
تم عہد شکن ہو، تمھیں غدار کہے گا
جو صاحبِ دل ہے ہمیں ابرار کہے گا
جو بندۂ حُر ہے، ہمیں احرار کہے گا
نام اونچا زمانے میں ہر انداز رہے گا
نیزے پہ بھی سر اپنا سرافراز رہے گا

کر ختم سخن محوِ دعا ہو گئے شبیر
پھر نعرہ زناں محوِ وغا ہو گئے شبیر
قربان رہِ صدق و صفا ہو گئے شبیر
خیموں میں تھا کہرام، جدا ہو گئے شبیر
مرکب پہ تنِ پاک تھا اور خاک پہ سر تھا
اس خاک تلے جنتِ فردوس کا در تھا

۱۹۶۴ء



# مدح

حسین شہید سہروردی مرحوم نے "راولپنڈی سازش" کیس ملزموں کی جانب سے وکالت کی تھی۔ مقدمے کے خاتمے پر انھیں یہ سپاسنامہ پیش کیا گیا۔

کس طرح بیاں ہو ترا پیرایۂ تقریر
گویا سرِ باطل پہ چمکنے لگی شمشیر
وہ زور ہے اِک لفظ اِدھر نطق سے نکلا
واں سینۂ اغیار میں پیوست ہوئے تیر
گرمی بھی ہے، ٹھنڈک بھی، روانی بھی، سکوں بھی
تاثیر کا کیا کہیے، ہے تاثیر سی تاثیر
اعجاز اسی کا ہے کہ اربابِ ستم کی
اب تک کوئی انجام کو پہنچی نہیں تدبیر

اطرافِ وطن میں ہوا حق بات کا شُہرہ
ہر ایک جگہ مکر و ریا کی ہوئی تشہیر
روشن ہوئے اُمید سے رُخ اہلِ وفا کے
پیشانیِ اعدا پہ سیاہی ہوئی تحریر

(۲)

حرّیتِ آدم کی رہِ سخت کے رہگیر
خاطر میں نہیں لاتے خیالِ دمِ تعزیر
کچھ ننگ نہیں رنجِ اسیری کہ پُرانا
مردانِ صفاکیش سے ہے رشتۂ زنجیر
کب دبدبۂ جبر سے دبتے ہیں کہ جن کے
ایمان و یقیں دل میں کیے رہتے ہیں تنویر
معلوم ہے ان کو کہ رہا ہوگی کسی دن
ظالم کے گراں ہاتھ سے مظلوم کی تقدیر



آخر کو سرافراز ہوا کرتے ہیں احرار
آخر کو گرا کرتی ہے ہر جَور کی تعمیر
ہر دَور میں سر ہوتے ہیں قصرِ جم و دارا
ہر عہد میں دیوارِ ستم ہوتی ہے تسخیر
ہر دَور میں ملعون شقاوت ہے شمر کی
ہر عہد میں مسعود ہے قربانیِ شبّیر

(۳)

کرتا ہے قلم اپنے لب و نطق کی تطہیر
پہنچی ہے سرِ حرفِ دعا اب مری تحریر
ہر کام میں برکت ہو ہر اک قول میں قوت
ہر گام پہ ہو منزلِ مقصود قدم گیر
ہر لحظہ ترا طالعِ اقبال سوا ہو
ہر لحظہ مددگار ہو تدبیر کی تقدیر

ہر بات ہو مقبول، ہر اک بول ہو بالا
کچھ اور بھی رونق میں بڑھے شعلۂ تقریر
ہر دن ہو ترا لطفِ زباں اور زیادہ
اللہ کرے زورِ بیاں اور زیادہ



## گیت



منزلیں، منزلیں،
شوقِ دیدار کی منزلیں،
حسنِ دلدار کی منزلیں، پیار کی منزلیں،
پیار کی بے پنہ رات کی منزلیں،
کہکشاؤں کی بارات کی منزلیں
بلندی کی، ہمت کی، پرواز کی
جوشِ پرواز کی منزلیں
راز کی منزلیں

زندگی کی کٹھن راہ کی منزلیں
بلندی کی، ہمت کی، پرواز کی منزلیں
جوشِ پرواز کی منزلیں
راز کی منزلیں،
آن ملنے کے دن
پھول کھلنے کے دن
وقت کے گھور ساگر میں صبح کی
شام کی منزلیں،
چاہ کی منزلیں
آس کی، پیاس کی،
حسرتِ یار کی
پیار کی منزلیں،
منزلیں حُسنِ عالم کے گلزار کی
منزلیں، منزلیں





موج در موج ڈھلتی ہوئی رات کے درد کی منزلیں
چاند تاروں کے ویران سنسار کی منزلیں،
اپنی دھرتی کے آباد بازار کی منزلیں
حق کے عرفان کی
نورِ انوار کی منزلیں،
وصلِ دلدار کی منزلیں
قول و اقرار کی منزلیں،
منزلیں، منزلیں

(فلم "قسم اُس وقت کی")

# گیت

اب کیا دیکھیں راہ تمہاری
بیت چلی ہے رات
چھوڑو
چھوڑو غم کی بات
تھم گئے آنسو
تھک گئیں اکھیاں
گزر گئی برسات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو
چھوڑو غم کی بات





کب سے آس لگی درشن کی
کوئی نہ جانے بات
کوئی نہ جانے بات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو غم کی بات
تم آؤ تو من میں اترے
پھولوں کی بارات
بیت چلی ہے رات
اب کیا دیکھیں راہ تمہاری
بیت چلی ہے رات

فلم "جاگو ہوا سویرا"

## گیت

ہم تیرے پاس آئے

سارے بھرم مٹا کر

سب چاہتیں بھُلا کر

کتنے اداس آئے

ہم تیرے پاس جا کر

کیا کیا نہ دل دُکھا ہے

کیا کیا بہی ہیں اکھیاں





کیا کیا نہ ہم پہ بیتی

کیا کیا ہوئے پریشاں

ہم تجھ سے دل لگا کر

تجھ سے نظر ملا کر

کتنے فریب کھائے

اپنا تجھے بنا کر

ہم تیرے پاس آئے

سارے بھرم مٹا کر

تھی آس آج ہم پر کچھ ہو گی مہربانی

ہلکا کریں گے جی کو سب حالِ دل زبانی

تجھ کو سُنا سُنا کر

آنسو بہا بہا کر

کتنے اُداس آئے
ہم تیرے پاس جاکر
ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر

(فلم سکھ کا سپنا)





## اُمیدِ سحر کی بات سنو

جگر دریدہ ہوں چاکِ جگر کی بات سنو
الم رسیدہ ہوں دامانِ تر کی بات سنو
زباں بُریدہ ہو زخمِ گلو سے حرف کرد
شکستہ پا ہوں ملالِ سفر کی بات سنو
مسافرِ رہِ صحرائے ظلمتِ شب سے
اب التفاتِ نگارِ سحر کی بات سنو
سحر کی بات، اُمیدِ سحر کی بات سنو

○

حیراں ہے جبیں آج کدھر سجدہ روا ہے
سر پر ہیں خداوند، سرِ عرش خدا ہے

کب تک اسے سینچو گے تمنائے ثمر میں
یہ صبر کا پودا تو نہ پھولا نہ پھلا ہے

ملتا ہے خراج اس کو تری نانِ جویں سے
ہر بادشہِ وقت ترے در کا گدا ہے

ہر ایک عقوبت سے ہے تلخی میں سوا تر
وہ رنج جو ناکردہ گناہوں کی سزا ہے

احسان لیے کتنے مسیحا نفسوں کے
کیا کیجیے دل کا، نہ جلا ہے نہ بجھا ہے

اکتوبر ۷۷ء



# پنجابی نظماں

لمی رات سی درد فراق والی

تیرے قول تے اساں وساہ کر کے
کوڑا گھٹ کیتی مٹھڑے یار میرے
مٹھڑے یار میرے، جانی یار میرے
تیرے قول تے اساں وساہ کر کے

جھانجراں وانگ، زنجیراں چھنکائیاں نیں
کدی پیریں بیڑیاں چائیاں نیں
کدی کنّیں مندراں پائیاں نیں
تیری تاہنگ وچ پٹ دا ماس دے کے
اساں کاگ سدّے، اساں سینہہ گھلّے
رات مکدی اے، یار آوندا اے
اسیں تک دے رہے ہزار وتے
کوئی آیا نہ بناں ختامیاں دے
کوئی پہنچا نہ سوا الاہمیاں دے



آج لاہ اُلاہمے مٹھڑے یار میرے
آج آویہڑے وچھڑے یار میرے
فجر ہووے تے آکھیے بسم اللہ
آج دولتاں ساڈے گھر آئیاں نیں
جیہڑے قول تے اساں وساہ کیتا
اوہنے اوڑک توڑ نبھائیاں نیں

۱۹۷۱ء

# گیت

کدھرے نہ پیندیاں دساں

وے پردیسیا تیریاں

کاگ اُڈاواں، شگن مناواں

وگدی واوے ترلے پاواں

تری یاد پوے تے رُوواں

ترا ذکر کراں تاں ہساں

کدھرے نہ پیندیاں دساں

وے پردیسیا تیریاں

درد نہ دساں گُھلدی جاواں

راز نہ کھولاں مُکدی جاواں





کس نوں دل دے داغ دکھاواں

کس در اَگے جھولی ڈھاواں

وے میں کس دا دامن کھساں،

کدھرے نہ پیندیاں دساں

وے پردیسیا تیریاں

شام اُڈیکاں، فجر اُڈیکاں،

آکھیں تے ساری عمر اُڈیکاں،

آنڈ گوانڈی دیوے بلدے

ربّا ساڈا چانن گھلدے

جگ وسدائے میں وی وساں

کدھرے نہ پیندیاں دساں

کدھرے نہ پیندیاں دساں

وے پردیسیا تیریاں

# میری ڈولی شوہ دریا

(۷۳ء کے سیلاب زدوں کے امدادی فنڈ کے لیے لکھی گئی)

کل تائیں سانوں بابلا
تو رکھیا ہک نال لا
سَت خیراں ساڈیاں منگیاں
جد جھلّی تتّی وا
اَج کیکن ویہڑیوں ٹوریا
کویں لاہے نی میرے چاء
میرے گہنے نیل، ہتھ پیر دے
میری ڈولی شوہ دریا
اَج لتھے سارے چاء
میری ڈولی شوہ دریا'



نال رُہڑدیاں رُڑھ گیاں سدھراں
نال روندیاں رُل گئے نیر
نال ہُونجے ہُونج کے لَے گئے
میرے ہتھ وی لیکھ لکیر
میری چُنّی بُک سواہ دی
میرا چولا لیر و لیر
لج پالن بوہڑے بھین دی
کوئی کرماں والے ویر
میرے کرماں والے ویر
میرا چولا لیر و لیر
میرے لتھے سارے چاء
میری ڈولی شوہ دریا

سستی مر کے جنّتن ہو گئی

ہیں تر کے اُو تر حال

سُن ہاڑے اس مسکین دے

ربّا پورا کر سوال

میری جھوک وَسّے، میرا ویر وَسّے

فیر تیری رحمت نال

کوئی پورا کرے سوال ربّا

تیری رحمت نال،

میرے لتھے سارے چار

میری ڈولی شوہ دریا



# ربّا سچیّا

ربّا سچیّا توں تے آکھیا سی

جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں

ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں،

ساڈا نَیب تے عالیجاہ ہیں توں،

ایس لارے تے ٹور کد پُچھیا ای

کیہہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں

کدی سار دی لئی اُو رب سائیاں

تیرے شاہ نال جگ کیہہ کیتیاں نیں

کتے دھونس پولیس سرکار دی اے
کتے دھاندلی مال پٹوار دی اے
اینویں ہڈاں وچ کلپے جان میری
جیویں پھاہی وچ کونج کرلاوندی اے
چنگا شاہ بنایا ای رب سائیاں
پولے کھاندیاں وار نہ آوندی اے

میںوں شاہی نئیں چاہیدی رب میرے
میں تے عزت دا ٹکر منگناں ہاں
میںوں تانگھ نئیں، محلاں ماڑیاں دی
میں تے جیویں دی نکر منگناں ہاں



میری منیں تے تیریاں میں مناں
تیری سونہہ جے اک دی گل موڑاں
جے ایہہ مانگ نئیں پجدی تیں ربا
فیر میں جاواں نے رب کوئی ہور لوڑاں

۱۹۷۴ء

## قطعہ

اَج رات اِک رات دی رات جی کے
اَساں جُگ ہزاراں جی لِتا اے
اَج رات امرت دے جام وانگوں
ایہناں ہتھاں نے یار نوں پی لِتا اے



# تراجم

# ناظم حکمت[1]

(زنداں سے ایک خط)

مری جاں تجھ کو بتلاؤں، بہت نازک یہ نکتہ ہے
بدل جاتا ہے انساں جب مکاں اس کا بدلتا ہے!
مجھے زنداں میں پیار آنے لگا ہے اپنے خوابوں پر
جو شب کو نیند اپنے مہرباں ہاتھوں سے
وا کرتی ہے در اس کا
تو آگرتی ہے ہر دیوار اس کی میرے قدموں پر
میں ایسے غرق ہو جاتا ہوں اس دم اپنے خوابوں میں
کہ جیسے اِک کرن ٹھہرے ہوئے پانی پہ گرتی ہے

[1] ترکی کا شہرۂ آفاق شاعر جس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکی کی جنگ حریت میں حصہ لیا اور بعد میں بیشتر عمر قید و بند اور جلاوطنی میں گزاری۔ ۱۹۶۳ء میں وفات پائی۔



میں ان لمحوں میں کتنا سرخوش و دلشاد پھرتا ہوں
جہاں کی جگمگاتی وسعتوں میں کس قدر آزاد پھرتا ہوں
جہاں درد و الم کا نام ہے کوئی نہ زنداں ہے
"تو پھر بیدار ہونا کس قدر تم پر گراں ہو گا؟"
نہیں ایسا نہیں ہے، میری جاں! میرا یہ قصہ ہے
میں اپنے عزم و ہمت سے
وہی کچھ بخشتا ہوں نیند کو جو اس کا حصہ ہے

## وِیڑا کے نام

اُس نے کہا آؤ،
اُس نے کہا ٹھہرو،
مسکاؤ کہا اس نے
مرجاؤ کہا اس نے
میں آیا،
میں ٹھہر گیا،
مسکایا
اور مر بھی گیا

؎ ناظم حکمت کی روسی بیوی





## وا میرے وطن

او میرے وطن! او میرے وطن! او میرے وطن!
مرے سر پہ وہ ٹوپی نہ رہی
جو تیرے دیس سے لایا تھا
پاؤں میں وہ اب جوتے بھی نہیں
واقف تھے جو تیری راہوں سے
مرا آخری کُرتا چاک ہوا
ترے شہر میں جو سِلوایا تھا
اب تیری جھلک
بس اُڑتی ہوئی رنگت ہے میرے بالوں کی
یا جُھرّیاں میرے ماتھے پر
یا میرا ٹوٹا ہوا دِل ہے
وا میرے وطن! وا میرے وطن! وا میرے وطن!

# اُولجز، عمر علی سلیمان[1]

## صحرا کی رات

کہیں بھی شبنم کہیں نہیں ہے
عجب، کہ شبنم کہیں نہیں ہے
نہ سرد خورشید کی جبیں پر
کسی کے رُخ پر، نہ آستیں پر
ذرا سی شبنم کہیں نہیں ہے
پسے ہوئے پتھروں کی موجیں
خموش و ساکن
حرارتِ ماہِ نیم شب میں سُلگ رہی ہیں
— اور شبنم کہیں نہیں ہے
برہنہ پا غول گیدڑوں کے
لگا رہے ہیں بنوں میں ٹھٹھے

[1] قازقستان کا ممتاز نوجوان شاعر





کہ آج شبنم کہیں نہیں ہے
ببول کے استخواں کے ڈھانچے
پکارتے ہیں'
نہیں ہے شبنم، کہیں نہیں ہے
سفید' دھندلائی روشنی میں
ہیں دشت کی چھاتیاں برہنہ
ترس رہی ہیں جو حُسنِ انساں لیے کہ شبنم کا ایک قطرہ
کہیں پہ برسے
یہ چاند بھی سرد ہو رہے گا
اُفق پہ جب صبح کا کنارا
کسی کرن سے دہک اُٹھے گا
کہ ایک درماندہ راہرو کی
جبیں پہ شبنم کا ہاتھ چمکے

— انتہا —

# کلامِ تازہ





## دلِ من مسافرِ من

مرے دل، مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا

## سرِ کوئے ناشناساں

ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تمھیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

۱۹۷۸ء





○

سہل یوں راہِ زندگی کی ہے
ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے
ہم نے دل میں سجا لیے گلشن
جب بہاروں نے بے رُخی کی ہے
زہر سے دھو لیے ہیں ہونٹ اپنے
لطفِ ساقی نے جب کمی کی ہے
بس وہی سُرخرو ہوا جس نے
بحرِ خوں میں شناوری کی ہے
جو گزرتے تھے داغ پر صدمے
اب وہی کیفیت سبھی کی ہے

۱۹۷۸ء

# پھول مرجھا گئے ہیں سارے

پھول مرجھا گئے ہیں سارے
تھمتے نہیں آسماں کے آنسو
شمعیں بے نور ہو گئی ہیں
آئینے چور ہو گئے ہیں
ساز سب بج کے کھو گئے ہیں
پائلیں بجھ کے سو گئی ہیں
اور اُن بادلوں کے پیچھے
دور اِس رات کا دلارا
درد کا ستارا





ٹمٹما رہا ہے
جھنجھنا رہا ہے
مسکرا رہا ہے

۱۹۷۸ء

○

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا ایسے نہیں ہوتا

گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل حسابِ خوں بہا ایسے نہیں ہوتا

جہانِ دل میں کام آتی ہیں تدبیریں نہ تعزیریں
یہاں پیمانِ تسلیم و رضا ایسے نہیں ہوتا

ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا

رواں ہے نبضِ دوراں گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا

۱۹۷۸ء





# کوئی عاشق کسی محبوبہ سے

گلشنِ یاد میں گر آج دمِ بادِ صبا
پھر سے چاہے کہ گل افشاں ہو تو ہو جانے دو
عمرِ رفتہ کے کسی طاق پہ بسرا ہوا درد
پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو
جیسے بیگانے سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی
آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو
گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم ملاقات کے بعد
اپنا احساسِ زیاں جانیے کتنا ہو گا

# کوئی عاشق کسی محبوبہ سے

گلشنِ یاد میں گر آج دمِ بادِ صبا

پھر سے چاہے کہ گل افشاں ہو تو ہو جانے دو

عمرِ رفتہ کے کسی طاق پہ بسرا ہوا درد

پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو

جیسے بیگانہ سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی

آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو

گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم ملاقات کے بعد

اپنا احساسِ زیاں جانیے کتنا ہوگا





ISBN: 978-81-7587-851-8
9 788175 878518